

کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ ”اسلام کیا ہے؟ کا جواب خدا نے اپنی... کتاب عظیم میں ان چار الفاظ میں دے دیا ہے کہ:
وَمَنْ لَّمْ يُحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۳۳)
جو لوگ اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہذا مسلم وہ ہیں جو اپنے تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرتے ہیں اور اسلام نام ہے کاروبار و عبادت کو قرآن مجید کے مطابق سرانجام دینے کا۔ میں نے اس اصول کی روشنی میں سال گزشتہ اسی تقریب سعید کے خطاب میں یہ بتایا تھا کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں۔ آج کی نشست میں میں اسی مسئلے پر ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی نظام قائم کس طرح سے ہوگا؟ اس موضوع کی اہمیت کی وضاحت کے لئے میں اس مثال کو دہرایا جاتا ہوں جو طلوع اسلام کی حالیہ اشاعت (دبابت فروری ۱۹۸۸ء) میں برجستہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔

ایک مثال

آپ نے ہاکی کے میدان کو دیکھا ہوگا۔ اس کی حدود و قیود خاص قواعد و ضوابط کے مطابق متعین کی جاتی ہیں لیکن وہ میدان مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہاکی کی ٹیم اس میں آکر اپنے جوہروں کی نمود کرے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر کوئی قوم سا مدت ہاکی کے میدان کے طول و عرض کی بھٹوں میں صرف کر دے لیکن ہاکی کی ٹیم تیار کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اگر وہ اس میدان کی حدود و قیود کا صحیح طور پر تعین بھی کر لے لیکن اس کے یہاں ہاکی کی ٹیم نہ ہو تو ان کی ان کا دشوں سے حاصل کیا ہوگا؟ اقلین کام ہاکی کی ٹیم تیار کرنا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ہمیں خود حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ سے لگ سکتا ہے۔

مغرب کے مستشرقین کا عام خیال یہ ہے کہ جب تک حضورؐ مکہ میں رہے آپ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہے جو درحقیقت فریضہ نبوت تھا۔ اور تشکیل مملکت کا خیال مدینہ جا کر پیدا ہوا جب وہاں کی فضا اس کے لئے سازگار نظر آئی۔ یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ فریضہ نبوت محض وعظ و نصیحت نہیں

حضورؐ کی مکی زندگی

تھا۔ قرآن کے متعین کردہ نقشے کے مطابق اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کا قیام تھا۔ اور یہ مقصد مکہ کی زندگی میں دنیا اقل ہی سے حضورؐ کے پیش نظر تھا۔ یہ حقیقت متعدد تاریخی شواہد سے واضح ہے۔ (مثلاً) تاریخ الکامل ابن الکثیرؒ ہے کہ رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں خود اپنے اہل خاندان کے نام جو پیغامات بھیجے ان میں ایک پیغام میں فرمایا تھا: یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس نصب العین سے بہتر نصب العین دکھا جو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس حکومت کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ دیر کی حیثیت سے کام کرے؟

اس پیغام کو مدح کرنے کے بعد ابن اثیرؒ نے لکھا ہے کہ نبوت کے تیسرے سال آپؐ نے ان لوگوں کو ”خدا کے حکم کے لئے جمع ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ یاد رکھو کہ ”یا تو خدا کا حکم غالب آئے گا اور یا میں اپنی جان سے گنہگاروں کا“ اسی قسم کی بات آپؐ نے قبیلہ عاتر کے اس بوڑھے سردار کے سوال کے جواب میں بھی جی جی سے حضورؐ سے پوچھا تھا کہ اگر میں آپؐ کی دعوت کو قبول کر لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ ”جنت کے باغات“ اس نے کہا کہ

یہ آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے مجھے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپ نے فرمایا :-

نعم النصر والثکین فی البلاد

خوش آمد فتوحات اور ملکوں پر حکومت -

لہذا یہ نصب العین پہلے دن سے حضورؐ کے سامنے تھا۔ مکی زندگی اس نصب العین کے حصول کی تیاریوں کا مرحلہ تھا۔ یہ تیاریاں کس قسم کی تھیں اس کی وضاحت قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس کے لئے حضورؐ کو دفاع کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا تھا: **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ خُذْكَ اللَّهُ** **رَفَقًا** **كَي تَبَارَكَ** **وَكُنْ أَتْبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ** (پیشہ) اے رسول! اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے تمہیں بے شک نصرتِ خداوندی کی ضرورت ہوگی۔ لیکن تنہا یہ نصرت کافی نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ تمہیں ان رفقاء کی جماعت کی بھی ضرورت ہوگی جو تمہارے دست و بازو بنیں گے۔ اسی جماعت اور اس کے سربراہ کو اللہ تعالیٰ نے **مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ** (پیشہ) کے تابندہ خطاب سے یاد فرمایا تھا۔ حضورؐ کی مکی زندگی انہی رفقاء کی تیاریوں کا نانا نہ تھا اور اس کا نصاب: **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِسَابَ وَيُؤْتِيهِمُ** **أَمْثَلُ** (پیشہ) یعنی قوانینِ خداوندی اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم اور مناسب تربیت سے ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما۔ خداوندی پیدا کرتا تھا رسول ان آدمیوں کو ان بان بناتا تھا۔ میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ انسانیت سازی تھا۔

حق تعالیٰ سپیکر ماکسزید و زوہد سالت در تن ماحال دمید

یہ اسلامی نظام کے قیام کے پروگرام کی اولین اہم ترین اور لاینفک کرطی تھی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

من از طریق نہ پرسم رفیق می جوئیم کہ گفتہ اند نخستیں رفیق باز طریق

اسی جہت سے حضورؐ نبی اکرمؐ کو المنزل کے حسین اور جامع لقب سے نوازا گیا۔ منزل کے معنی ہوتے ہیں وہ سالار کاندواں **صحابہ کرامؓ** جو رفقاء کے کا رطل کا صحیح انتخاب کرے۔ حضورؐ کے ان رفقاء کے کارواں میں تمام صحابہؓ کبار و شہداء استثنائاً شامل ہیں۔ ان ہی کے ہاتھوں سے یہ نظام قائم ہوا اور آگے چلا تھا۔ نظامِ اسلام جب بھی دوبارہ قائم ہوگا اس کے لئے اولین شرط اسی قسم کی جماعتِ مؤمنین کا وجود میں لانا ہوگا۔ یاد رکھیے! کوئی شخص نہ حضورؐ کے زمانے میں پیدا ہونے والا ہوگا نہ اب پیدا ہونے والا ہوگا۔ حضورؐ نے بھی ضروری تعلیم و تربیت سے مؤمنین کی جماعت تیار کی تھی اور اب بھی اسی طریق سے مؤمنین کی جماعت کا تیار کیا جانا لازمی ہوگا۔ اسلامی نظام انہی کماحقہوں قائم ہو سکے گا۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ حضورؐ کی تیار کردہ جماعت میں تمام صحابہؓ کبار شامل تھے میرے لئے یہ شکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ میں ان سب کی سیرت و کردار کے نمایاں خط و خال پیش کر سکوں۔ مجھے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا **حضرت عمر فاروقؓ** اور یہ منتخب بہت ہی حضرت عمر فاروقؓ ہیں۔ میرے اس انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو خود نبی اکرمؐ نے انہیں خدا سے مانگ کر لیا تھا اور دوسرے یہ کہ اسلامی نظام انہی کے زمانہ خلافت میں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ منبہر شہود پر آیا تھا۔ اس نظام کا سنگ بنیاد حضورؐ نبی اکرمؐ کے

مقدس ہاتھوں سے رکھا گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس نونائیدہ نظام کی مخالفت کی اور شعلوں سے مدافعت کی اور اس طرح اسے قابل بنادیا کہ یہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مکمل شکل میں سامنے آجائے۔ میں نے اپنی کتاب "شاہکار رسالہ" میں اس دور کا پورا نقشہ مرتب کر کے دست کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ میرا آج کا خطاب بھی اس سے متعلق ہے۔



دعائے نبویؐ میں نے کہا ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کو (یا یوں کہیے کہ عمر ابن الخطاب کو) خدا سے مانگ کر لیا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضورؐ نے خدا سے دعا کی تھی کہ

یا الہ العالمین! اسلام کو ابو جہل یا عمر ابن الخطاب کے ذریعے تقویٰ بخش ان دونوں میں سے جو بھی تجھے محبوب ہے اسے مشرف بہ اسلام فرما۔

ابو جہل، عمر ابن الخطاب کا ماموں تھا۔ ان دونوں کا معاشرہ میں کیا مقام تھا اور ان کی مضر صلاحیتوں کی کیا کیفیت تھی اس کا اندازہ حضورؐ کی اس دعا سے لگ سکتا ہے۔ تعلیم و تربیت نبویؐ، انسانی صلاحیتوں کو جس قسم کی چلا دے کر انہیں جس تقویم کا مظہر بنادیتی ہے اس سے عمر ابن الخطاب، فاروقی اعظم بن کر آسمانی انسانیت پر مہر عالمتاب کی طرح ایسے چمکا کہ اس کی ضوفا نیاں ابد الابد تک دھندلا بندگی عالم بن گئیں۔ اور ابو جہل اس سے محروم رہا تو جہالت کی زندگی جیا اور ذلت کی موت مرا۔



حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے متعلق ہمارے ہاں جو روایات عام طور پر مشہور ہیں وہ کچھ صحیح نظر نہیں آتیں۔ اسلام لانے کا واقعہ کہا یہ جاتا ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ اٹلی میں سے گذر رہے تھے کہ ان کی ہمیشہ کی زبان سے قرآن مجید کی چند آیات اتفاقاً آپ کے کان میں پڑ گئیں۔ پہلے تو ان کا رد عمل سختی اور بدشتی کا تھا یہاں تک کہ انہوں نے اپنی بہن اور بہنوئی کو پیٹ بھی دیا لیکن بعد میں وہ ان سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے۔ یہ روایت اس لئے قرین تیار کیا جس نظر نہیں آتی کہ:

(۱) حضرت عمرؓ کچھ پڑھے تھے وہ ملک سے باہر دوسری اقوام کے زعمائے سیاست اور مشاہیر فکر و تدبیر سے ملاقاتیں کرتے۔ ان کے فوقی تجسس کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے قورۃ کو براہ راست سمجھنے کے لئے عبرانی زبان سیکھی اور اس پر عبور حاصل کر لیا۔

(۲) حضور نبی اکرمؐ کی انقلابی دعوت چھ برس سے مکہ میں پہچان پیدا کر رہی تھی۔ حضورؐ خلوت و جلوت میں قرآنی پیغام کو عام کر رہے تھے۔ یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ عمر ابن الخطاب جیسا ان اس دعوت کے مالک و ماعلیہ سے بے خبر رہا ہو اور اس نے اس سے پہلے قرآنی آیات کو نہ سمجھی نہ سنا ہو نہ انہیں درخور اعتنا سمجھا ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ خود بیان کیا ہے۔ اسے غور سے سنئے اور مجھوم جائیے۔ ان کا بیان ہے:-

جاہلیت میں، میں شراب کا رسایا تھا۔ ہر شب، ہم، یا ان قدر خوار کی ایک رنگین محفل جا کرتی تھی۔ ایک رات میں گیا تو وہاں کسی کو موجود نہ پایا۔ میں کئی ایک اور مقامات میں پہنچا لیکن اتفاق کہ شراب

مجھے وہاں بھی نہ ملی۔ اب میں نے سوچا کہ یوں گھر لوٹنے کی بجائے، کعبہ کا طواف ہی کرتا جاؤں۔ حرمِ کعبہ میں سناٹا تھا۔ دیکھا کہ ایک شخص تنہا غلو عبادت ہے اور آخری آواز سے کچھ بڑھ رہا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ محمد رسول اللہ ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ موقع اچھا ہے۔ دیکھو کہ یہ شخص تنہائی میں کیا کرتا اور کیا کہتا ہے۔ دس بے پاؤں آگے بڑھا، محتاط تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں اس لئے میں غلافِ کعبہ میں چھپ گیا اور سر کیا سر کیا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھ میں امدان میں غلافِ کعبہ کے سوا کچھ اور حامل نہ تھا۔ آپ نہایت جذب و کیفیت کے عالم میں کھڑے، قرآن مجید کی یہ آیات پڑھ رہے تھے:

قُلَّا أَفَسِمَ بِنَا تُبْصِرُونَ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ۔ ان الفاظ میں کچھ ایسا بلا کا اثر تھا کہ میں نے کہا کہ قرآن جو کہتے ہیں کہ یہ شخص نہایت بلند پایہ شاعر ہے تو وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں، کہ اتنے میں آپ نے اگلی آیت پڑھی کہ إِنَّهُ أَفْزَلُ مَرْسُولٍ مِّنْ دُونِهِ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ۔ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ۔ میں نے کہا کہ یہ تو اپنے شاعر ہونے سے بھی انکار کرنا ہے۔ تو پھر جیسا کہ قرآن میں کہتے ہیں کہ یہ کاہن ہوگا، کہ اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے کہ ذَلْكَ بِقَوْلِ كَاهِنٍ۔ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ۔ قرآن کے اسلوب بیان نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے، نہ کاہن کا، تو پھر یہ ہے کیا؟ میرے دل کی اس بات کا جواب مجھے ان الفاظ میں ملا۔ تَذَكَّرَ بَنِي إِسْرَءِيلَ الْغَالِيُونَ (۲۸-۲۹)۔ آپ یہ پڑھتے جا رہے تھے اور مجھ پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

کھینگی ہوئی رات، تاروں کی جھاڑوں، حرمِ کعبہ اور اس میں کامل سکوت۔ اس سکون افرادِ ماحول میں خود صاف قرآن کی زبانِ اقدس سے قرآن کی آیات کی نشید شروع ہو رہی۔ اکتشش و محویت کے ان تمام عناصر کے حسین امتزاج نے وہ کیفیت پیدا کی جو اس خطاب کے فکری ارتقاء کے نقطہ و عروج اور نفسیاتی تغیر کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کا موجب بن گئی۔ یہ وہ مقام تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر
خلوت کی گھڑی گذری۔ خلوت کی گھڑی آئی
ٹھٹھنے کو بے بجلی سے، آنسو شش بحاب آخر

اس مقام پر عمرؓ کی شدتِ شوق وہ فنیہ بن گئی جس نے شکوک و شبہات کے حسن و خفاش کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا، اور ان کے نیچے، لاشعور میں پیلوہ لئے واسے قیاسات کو یقینِ محکم کی شکل میں، شعور کی سطح پر لے آئے کا موجب بن گئی۔ (عمرؓ کا بیان ہے) :-

رسول اللہ قرآن پڑھتے جا رہے تھے اور میں بے اختیار رو رہا تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے نماز ختم کر لی اور گھر جانے کے مادہ سے روانہ ہوئے۔ میں بھی دس بے پاؤں آپؐ کے پیچھے ہو لیا۔ گھر کے نزدیک پہنچے تو میں قریب ہو گیا۔ آپؐ نے آہٹ پا کر مڑ کر دیکھا تو مجھے پہچان لیا اور پورے دس بے پاؤں کے ساتھ کہا۔

ابن خطاب! تم ایسے وقت میں یہاں کیسے؟

آپ کے سامنے اُس وقت ابن خطاب نہیں تھا۔ تین دن پہلے جو آپ نے دیکھا اُنکی تھی، اس کی قبولیت مجھ سے پکیر میں سامنے تھی۔ ابن خطاب نے کہا کہ

یہ گواہی دینے کے لئے کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں۔

اس پر حضورؐ نے خدا کا شکر ادا کیا اور میرے سینے پہ ہاتھ رکھ کر میرے لئے ثبات و استقامت کی دعا مانگی۔

عمرہ اسلام لے آیا اور اس کی حیثیت اُور پر ۔

نفرہ ندر عشق کہ غوین جگرے پیدا شد

آند و بیخرا از غولیش با غوشش حیات

زندگی گفت کہ در خاک تنیدم بجمہ عمر

تا ازین گشت بد ویرینہ در سے پیدا شد

یہ ہے حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کا وہ واقعہ جسے انہوں نے خود بیان فرمایا — وہ واقعہ جس سے مقتا طیس اور فولاد

کا غیر مرئی اور غیر محسوس رشتہ نگاہوں کے سامنے آجاتا اور اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ مقتا طیس کی

طرف کھینچ کر جانے کے لئے فولاد بننا ضروری ہے۔ یا، یوں کہئے کہ مقتا طیس، فولاد کو اپنے آغوش میں لیتا ہے مٹی

کے ڈھیلے کو نہیں۔ وہ پکار کر کہتا ہے کہ

بجلی ہوں نظر کوہ و سیاہاں پہ ہے میری

ابن خطاب، شراب کی تلاش میں بھٹکا پھرتا تھا۔ نمکدہ ایقان سے اسے ایسا جڑبوڑ جہاں تاب نصیب ہو گیا جس نے حقیقت

پر پڑے ہوئے سب پر مٹے اٹھا دیئے اور وہ ابن خطاب سے قاروقی اعظم بن گیا۔

صد سالہ دورِ چرخِ محض ساغر کا ایک دور

نیکے جو میکدے سے تو دُنیابدل گئی



اولیں خطبات | خلیفہ منتخب ہوئے کے بعد آپ نے جو دو خطبات ارشاد فرمائے وہ اس حقیقت کی عکاسی کرتے

ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم اور مستحکم ہوتا ہے ان کے ہمیشہ نظر مقاصد کیا

ہوتے ہیں امدان کے عزائم کیا۔ آپ نے خطبہ اقل میں ارشاد فرمایا ۔

حضرت عمرؓ کا پہلا خطبہ

لوگو! میں تمہیں میں سے ایک ان ہوں۔ اگر مجھے خلیفہ رسول اللہ کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں ہرگز

یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔

آپ نے یہ الفاظ ایسے خلوص اور انکساری کے ساتھ کہے کہ سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ چنانچہ انہوں نے

محسوس کیا کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے جو کیا تھا کہ خلافت کی ذمہ داریاں (حضرت) عمرؓ کی سستی کو زخمی سے بدل دیں گی،

وہ درست تھا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگو! میں خدا سے تین دھائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین کہو۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز و الحاح سے کہا :-

بارالہ! میں سخت ہوں۔ مجھے حق کی موافقت، اپنی رضا طلبی اور احساسِ آخرت کے لئے نرم کر دے۔ یہ کہہ کر آپؐ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے آمین کہا، تو آپؐ نے دوسری دُعا مانگی کہ
یا اللہ! میں کمزور ہوں۔ مجھے قوی بنا دے تاکہ میں دین کے دشمنوں، منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ایسا قوی نہیں کر میں ان کے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پر دستِ دلازدی کرنے لگ جاؤں۔ آپؐ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پر سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے آمین کہا۔ تو آپؐ بدرگاہِ رب العزت عرض کیا کہ
یا اللہ! میں بخیل ہوں۔ مجھے امورِ خیر کے لئے سخی بنا دے۔ لیکن اس سخاوت میں ایسا کاری کا شائبہ نہ ہو۔ مجمع پر سکوت چھا رہا تھا۔ غصہ سے توقف کے بعد آپؐ نے فرمایا :-

ایہا الناس! اللہ نے میرے دو رفقاء کے بعد مجھے تم میں باقی رکھا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا میں اسے کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سراخیام کر دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہوگا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہوگی تو اس کے لئے میں حقیقی الامکان ایسے لوگوں کو متعین کر دوں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح راستے پر چلیں گے تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کر دوں گا۔ اگر غلط روئے اختیار کریں گے تو انہیں عبرت ناک سزا دوں گا۔

اس کے بعد آپؐ نے سامعین سے کہا کہ

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی۔ اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔ اپنے نفوس کا وزن کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا وزن کیا جائے۔ قیامت کے دن کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔

اس کے بعد پھر اپنے لئے ایک اور دُعا مانگی جس میں کہا کہ

بارالہ! مجھے تفکر و تدبیر قرآنی عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔

یا اللہ! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں۔ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

یہ مختصر خطبہ تھا۔ دوسرے قدرے مفصل خطبہ میں آپؐ نے حمد و ثناء کے بعد ہر ممبرِ مصلیٰ پر فرمایا :-

مفصل خطبہ | مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ میری سختی سے خائف اور میری درشتی سے لرزنا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمرؓ اس وقت بھی ہم پر سختی کرتا تھا جب ہم رسول اللہؐ کے سایہٴ عاطفت میں تھے اور اس وقت بھی جب ہمارے اور اس کے درمیان حضرت صدیق اکبرؓ حائل تھے۔ لیکن اب کیا ہوگا جب ہم میں نہ رسول اللہؐ موجود ہیں نہ ابو بکر صدیقؓ۔ اور معاملات تمام کے تمام اس کے ہاتھ میں ہیں۔

جس شخص بھی یہ کہتا ہے وہ ٹھیک کہتا ہے۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتا ہے کہ مجھے رسول اللہ کی مصاحبت کا شرف حاصل تھا اور میں ان کا فرماں پذیر تھا۔ وہ سراپا نرمی اور رحمت تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ وہ مؤمنین کے لئے حاجت اور رحمت کا سرچشمہ ہیں۔ یاد گاہ رسالت میں میری حیثیت ایک شمشیر برہنہ کی سی تھی۔ جب حضورؐ چاہتے اس شمشیر کو اذان کا عطاء کر دیتے اور جب چاہتے اسے نیام میں رکھ لیتے۔ میں حضورؐ کی خدمت میں اسی طرح رہا تاں کہ اللہ نے آپ کو یاد فرمایا۔ حضورؐ آخر وقت تک مجھ سے خوش رہے۔ اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں اور اس سعادت عظمیٰ پر مجھے فخر و تازہ ہے۔

اس کے بعد اُمت کی زمام کا حضرت ابو بکرؓ صدیق کے سپرد کر دی گئی جن کے تحمل اور نرمی سے انکا منہیں کیا جاسکتا۔ میں ان کا بھی خادم اور مددگار تھا اور اپنی سختی کو ان کی نرمی میں سمودیتا تھا۔ میں حسب سابق ایک برہنہ تلواری تھا جسے وہ شب و وقت چاہتے برہنہ کا رلاتے، اور جب چاہتے زیر نیام کر لیتے۔ میں اسی طرح ان کے ساتھ رہا یہاں تک کہ عدائے انہیں ہم سے جدا کر دیا۔ وہ بھی آخر دم تک مجھ سے خوش رہے۔ اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں۔ اور یہ سعادت میرے لئے وجہ مسرت ہے۔

اور اب کہ، اسے لوگو! تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میری وہ سختی نرمی میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیں۔ رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جراتِ ایمانی رکھتے ہیں، تو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کرے گا تو میں اسے اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر نہ لگا کر بد میرے رخسار پہ پنا پائوں گا۔ دوزخ تاں کہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن اس تمام سختی کے باوجود، میں اہل حق کے لئے خواہتے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقائق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ اور تم پر میرا صرف یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور مال غنیمت میں سے جو اللہ تمہیں عطا کرے (یعنی مملکت کی آمدنی میں سے) اپنے کفالت کے لئے لوں، لیکن اسے ناحق نہ لوں۔ تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہارے عطیات اور وظائف میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں۔ اور یہ حق بھی کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ تمہیں بلا ضرورت گھر والیں آنے سے نہ روکے رکھوں۔ اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہ پر داخت کروں۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو! میرا کھٹا ٹھکانہ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں میری مدد کرو۔ تمہاری جو خدمات اللہ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔ میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں۔ میں یوم الحساب

کا منتظر ہوں۔ جب مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا لیا ادا سے کیسے خرچ کیا۔
یہ تھا مملکت اسلامیہ کا وہ منشور جس سے عہد فاروقی کا آئین ڈھوا۔



منصب خلافت پر سرفراز ہونے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مملکت کے مال و دولت میں سربراہ مملکت کا حصہ کس قدر ہونا چاہیے۔ یہ سوال سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا کہ معلوم کرو کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم از کم روزانہ اجرت کیلئے وہی اجرت آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقاء میں سے ایک نے کہا کہ اتنے کم روزانے میں آپ کا گزارہ کس طرح ہوگا، تو آپ نے فرمایا کہ اسی طرح جس طرح اس میں اس مزدور کا گزارہ ہوتا ہے۔ ادا اگر گزارہ نہ ہو تو اس میں اس مزدور کی اجرت بڑھا دوں گا تاکہ اس طرح خود میرا وظیفہ بڑھ جائے۔ میرا عیار رزقیت مزدور سے بلند نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے لئے جو وظیفہ مقرر کیا وہ یہ تھا۔

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک سردی کا ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک ایک احرام اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا حال ان کپڑوں کا اور اس خوراک کا انداز کیا تھا، اس کی ہمت آگے چل کر بات ہوگی۔



تاریخ انسانیت میں تین ایسی خطرناک گھاٹیاں آتی ہیں جہاں سے پھسلنے کے بعد قومیں سیدھی جہنم میں جا گرتی ہیں۔
تین خطرناک گھاٹیاں | فرعون یعنی ملکیت۔ ہامان یعنی مذہبی پیشوا شیت اور قارون یعنی رزق کا مسئلہ۔ خلافت میں ملکیت تو خود بخود خط سے کٹ جاتی ہے۔ باقی دو گھاٹیوں کے متعلق حضرت عمرؓ نے قوم کو ابتداء ہی سے ان خطرات سے آگاہ کر دیا۔ رزق کے متعلق کہا۔

اے لوگو! تم میں سے کوئی شخص رزق کی طلب جستجو سے فارغ ہو کر نہ بیٹھ جائے اور یہ کہتا رہے کہ اے اللہ مجھے رزق دے۔ یاد رکھو! آسمان سے کوئی ٹہن نہیں برستا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے رزق کی جو ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے وہ اسے براہ راست پوری نہیں کرتا۔ وہ اسلامی نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ پیدائش رزق کے متعلق آپ نے فرمایا کہ متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر خدا کے قانون پر بھروسہ کرتا ہے۔

قرآن کافی ہے | جہاں تک مذہبی پیشوا شیت کا تعلق ہے ایک شخص ایک دفعہ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ قرآن کافی ہے۔ امیر المؤمنین حبیب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی بھی باتیں لکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن سے بھی زیادہ اچھی، اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا :-

یاد رکھو تم سے پہلی اُمّتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے اجارہ ور بہان (علماء و مشائخ) کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے یہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔

فاروقی نگاہ اسے کہتے ہیں حسب کتاب اللہ آپ ہی کا ارشاد تھا۔



حاکم و محکوم کا تعلق | تاریخ انسانیت میں وہ مشکل ترین مسئلہ جس کا اطمینان بخش حل آج تک دریافت نہیں ہو سکا یہ ہے کہ حاکم اور محکوم کے تعلقات کس قسم کے ہونے چاہئیں، اسلام میں حاکم اور محکوم کی تفویض اور تعمیر قویاں نہیں رہتی کیونکہ اس میں کسی ایک ان کو حتیٰ حکومت حاصل ہی نہیں ہوتا لیکن اس میں بھی ایسے اربابِ حل و عقد تو بہر حال ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں معاشرہ کا نظم و نسق سارا انجام پاتا ہے۔ اسلامی نظام میں ان اربابِ نظم و نسق کی پوزیشن کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق حضرت عمر فاروق کے بکثرت ارشادات تاریخ میں منقول ہیں۔ میں ان میں سے دو چار مثالاً ہمیشہ خدمت کرتا ہوں۔ انہوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص کے نام اپنے مکتوب میں ایک فقرہ ایسا لکھا جس میں فلسفہ سیاست و اخلاق کی ساری تفصیل سمٹ کر آگئی ہے۔ آپ نے لکھا:-

اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے پاس تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ اللہ کی مخلوق تمہیں کیسا سمجھتی ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ اللہ کے یہاں تمہارا مرتبہ وہی ہے جو مخلوق کے یہاں ہے۔

حضرت عمر بن عاص کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ

تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ کہ اگر تم رعایا ہو تو تم چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہونا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کے بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

ان ہی کے نام ایک اور خط میں لکھا :-

یاد رکھو! جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ صبر و برداشت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے اس کی رعایا بد بخت ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا :-

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں۔ اور جس میں سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں۔ بلا صفت نرمی اور بلا جبر قوت یہ ہے اصل الاصول۔

ایک خطبے میں فرمایا :-

جو شہر پیدا کر کے غالب آیا وہ غالب نہیں مغلوب ہے جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔ جس میں تکبر ہو سمجھ لو کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہے۔

جو امور سلطنت کے لئے خطرناک ہوتے ہیں ان میں آپ نے ایک ایسا اصول بیان کیا کہ جو آج بھی بصیرت اس پر غور کرتی ہے ان وجہ میں آجاتا ہے۔ فرمایا :-

طاقت و رخاں اور کمزوری و اندازہ دونوں حکومت کے لئے نقصان دہاں ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے عیض میں مقبرہ پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا :-

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابل شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے مارنا نہیں، بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مؤاخذہ کرنا ہے۔ حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا کہ عمر میرے قریب ہوتے تو ان کے مشوروں سے کس قدر مستفید ہوتا !

آپ نے ایک دفعہ حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کو ایک تفصیلی مرسلہ بھیجا جس میں بعض بنیادی ہدایات درج تھیں۔ وہ ایسا اہم ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اسے سارا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ غور سے سنیے۔ فرمایا :-

جب بھی کبھی دو ایسے معاملات سامنے آئیں جن میں ایک "اللہ کے لئے" ہو اور دوسرا دنیا کے (طبعی مفاد) کے لئے ہو دنیا سے متعلق حصہ پہ اللہ سے متعلق حصہ کو ترجیح دو (یعنی دنیاوی مفاد کو ہمیشہ

مستقل اقدار خداوندی کے تابع رکھو)۔ اگر کبھی قبائلی تنازعہ بھڑکے اور کوئی شخص

قبائلی عصبیت

یہ آواز اٹھائے کہہ کر آواز دے تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی آواز ہے۔ ایسا کہنے والوں

کی تلوار سے خبر لو، تاکہ وہ اللہ اور اپنے امام کی طرف رجوع کر لیں۔ مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ قبیلہ

حذیفہ کے بعض افراد نے "یہ آواز" کہہ کر پکارا ہے۔ (اگر یہ سچ ہے تو) میرا رسلہ پہنچتے ہی انہیں سخت

مزدور تاکہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔

آپ نے بعد فرمایا، عزیزان من! کہ اسلام میں قبائلی تفریق کس قدر سنگین جرم قرار پاتی ہے۔ بہر حال آپ نے اپنے مکتوب میں لکھا

بھائی! تم تمہاری ذات کا تعلق ہے تم سب کے لئے اپنے دروازے کیساں طور پر کھلے رکھو۔ ان کے کام خود

سراجام دو۔ مریضوں کی عیادت کرو۔ ان کے جنازوں میں شرکت کرو کیونکہ تم ان ہی میں سے ایک فرد

ہو، اس فرق کے ساتھ کہ اللہ نے تم پر بہت بڑی ذمہ داری محال دی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم

اور تمہارے گھروالے ایسا کپڑا پہنتے۔ ایسا کھانا کھاتے اور ایسی سواریاں رکھتے ہیں، جو عام مسلمانوں

کو میسر نہیں۔ خدا کے بندے! سچ کہہ رہا ہوں کہ اس کا اندازہ اس جانور کا سا نہ ہو جو چلنے میں کا گدرا ایک شاد آ

دادی پر ہوا تو سوائے ٹہر خوری اور فرہی کے اس کے سامنے کوئی مقصد ہی نہیں رہا، حالانکہ وہی پیڑھی

اور فرہی اس کی ہلاکت کا موجب تھی۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ حاکم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ جب

حاکم بگڑتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بد بخت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے اس کی رعیت

بد بخت ہو جائے۔

یہ تھا حضرت عمرؓ کی احتیاط کا عالم اور اس قسم کی تھیں ان کی ہدایات جو وہ ذمہ دار ابابہ ملکیت اور پلہ لاریں جیوش دعا کو بھیجتے رہتے تھے۔

۵۵۷

اکثر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قابلِ اعتماد کس شخص کو سمجھا جائے۔ اس باب میں آپ نے ایسا معیار بیان فرمایا ہے کہ اس سے یہ اہم سوال نہایت عمدگی سے حل

قابلِ اعتماد کون ہوتا ہے

ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص سے آپ نے کہا کہ اپنی بات کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو قابل اعتماد ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا :-

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ — اس نے کہا نہیں۔

پھر پوچھا: کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟ — اس نے کہا نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا: کہ کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ہے۔

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں تو آپ نے فرمایا پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے معلوم ہوتا

ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا ہو گا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابل اعتماد ہے۔

غور کیجئے کہ کسی شخص کے ثقہ اور قابل اعتماد ہونے کے لئے آپ نے کیا معیار قرار دیا ہے۔

اور آپ کا یہ قول تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ کسی شخص نے کہا کہ مؤمن کسی کو دھوکہ نہیں دیتا

آپ نے کہا کہ بات پوری کہو مؤمن نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے نہ کسی سے دھوکہ کھاتا ہے۔



اب آئیے دیانت کی طرف۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ خلافت کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو اتنا ہی جانتا

ہوں کہ خلیفہ سے پوچھا جائے گا ”کہاں سے لیا اور کہاں خرچ کیا“ اگر وہ خدا کو اس کا

اطمینان بخشنے کا جواب دے سکا تو خلافت ہے ورنہ ملوکیت۔ اور یہ درحقیقت تفسیر حقّی حضور

بنی اکرم کے اس ارشاد گہما کی کہ

سربراہ مملکت کی حیثیت ایک خزانچی کی ہوتی ہے اس کے پاس ڈھیروں مال جمع رہتا ہے لیکن سب اس

لئے کہ جہاں تقسیم کرنے کا اُسے حکم دیا جائے وہاں تقسیم کر دے۔

اس معاملے میں حضرت عمرؓ کی احتیاط کی شدت کا کیا عالم تھا۔ اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن میں اس باب

میں ایک ایسی مثال پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جو بظاہر اتنی چھوٹی ہے جیسے آنکھ کا تیل لیکن اس

میں تفصیلات کا ناموں بھرا آسمان سمویا ہوا ہے۔ ایک دن بیت المال کا خزانچی جھاڑو دینے لگا تو

کوڑے میں سے ایک درہم ہاتھ لگا (درہم اس زمانے کا چھوٹے سے چھوٹا سکہ تھا) اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا

ایک بچہ پاس کھڑا تھا اس نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ امیر المومنین کا

علاؤ آگیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ نے اس سے کہا کہ میرے بھائی! میں نے تمہارے

ساتھ کون سی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلا لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب امت محمدیہ

مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔

سربراہ مملکت کی اس دیانت کا نتیجہ تھا کہ مملکت کے چھوٹے سے چھوٹے اہل کار بھی اسی طرح کے میں اور

ملائن کا مال غنیمت اور دیانتدار بن گئے تھے۔ جب مسلمانوں نے ایلین فتح کیا ہے تو وہاں سے اس قدر مال

ارہوں درہم و دینار۔ جو اہرات اور لوازمات کے ڈھیر۔ نہ کار فرم و ملبوسات وغیرہ۔ حضرت سعدؓ نے جب

یہ مال و دولت دانا خلافت میں بھیجا تو اس کے ساتھ امیر المومنین کو خط بھی لکھا جس میں کہا کہ اس مال و دولت کو دیکھ کر یقیناً آپ کو خوشی ہوگی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی اس بات سے ہوگی جو میں اب لکھ رہا ہوں یہ تمام نذر جو اہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے لے کر جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے ایک سو فی بھی اپنے پاس نہ رکھی سب کچھ لاکر اپنے قائد کے سامنے رکھ دیا یہ بڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے اور کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال کہاں مل سکتی ہے؟ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے انہوں نے کہا کہ امیر المومنین آپ کو معلوم ہے کہ سپاہیوں کی اس دیانت کا راز کیا ہے؟ راز یہ ہے کہ

چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لئے آپ کی رعایا بھی پاکدامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو رعایا کی نیت میں بھی فرق آجاتا۔

نماں حکومت کے اخلاق و کردار تو ایک طرف ان کی عام روش زندگی کا اثر عوام پر کس قدر پڑتا ہے اور اس کی عمال کی روش زندگی کا اثر

آپ نے دیکھا کہ حضرت طلحہؓ طواف میں رنگا ہوا کپڑا پہنتے تھے۔ آپ نے کہا کہ طلحہ! طواف میں رنگدار کپڑا پہننے کا معنی دارد؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو مٹی کا رنگ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ طلحہ! دوسرے لوگوں کی نسبت آپ حضرات کو زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کے امام (لیڈر) ہیں جن کی اقتدا عوام کرتے ہیں مگر کوئی جاہل آدمی آپ کو دیکھے گا تو وہ اپنے لوگوں سے کہے گا کہ میں نے حضرت طلحہؓ کو بحالت طواف رنگدار کپڑا پہنے دیکھا تھا۔ یوں تمہارا معصوم سامع لوگوں کے لئے سبب بن جائے گا۔ لہذا ہم لوگوں کو بڑی احتیاط برتنی چاہیے۔



پہلے (اور متعدد بار) بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ افراد معاشرہ کو رزق کی ذمہ داری

خلافت ہے کہ

اگر قرأت کے کنارے کوئی گناہ بھی جھوک سے مرگیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

عوام کی ضروریات کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لئے آپ کس حد تک آگے چلے جاتے تھے اس کے متعلق آپ اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ جب آپ کے زمانے میں قحط پڑا تو آپ نے اپنے آپ پر یہ پابندی عائد کر لی کہ جب تک قحط رہے گا وہ سالن کو ہاتھ نہیں لگائیں گے صرف زیتون کے تیل کے ساتھ سوکھی روٹی کھائیں گے۔ اس سے آپ کی صحت بڑی طرح متاثر ہوئی اور آپ دن بدن لاغر ہوتے چلے گئے۔ اس پر آپ کے رفقاء کو تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ اس تبدیلی غذا کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے آپ اپنے معمول کی غذا کی طرف پلٹ آئیے۔ اس کے جواب میں آپ نے وہ فقرہ کہا کہ اگر دنیا کے سربراہان مملکت اسے اپنی زندگی کا اصول بنالیں تو یہ جہنم آج ہی تبدیل ہر فرد کوں ہو جائے۔ آپ نے فرمایا:-

نیچے لوگوں کی تکلیف کا احساس کس طرح ہو سکتا ہے جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گذرے جہاں پر گذرتی ہے۔
اس قسم کے سربراہان مملکت کی موجودگی میں رعایا کو سربراہ ملک ایوان شاہی کی طرف سراٹھا کر بصد حسرت و یاس یہ کہنے کی
ضرورت نہیں پڑتی کہ

تمہیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اترے ہو یا م سے !

وہ سربراہ مملکت خاکساروں کے حالات براہ راست معلوم کرنے کے لئے راتوں کی تنہائیوں میں — جب سارا عالم سوٹا
تھا — شہر گشت لگاتے تھے۔ اسی گشت کے دوران انہوں نے ایک رات دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکاوا ہی ہے اور
دو تین بچے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ بچے کیوں رو رہے ہیں ؟ اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں
کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا میں پانی ڈال کر جو لے کر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ آپ نے اس
عورت سے کہا کہ کیا تم نے امیر المومنین کو اس کی اطلاع دی ہے ؟ اس کے جواب میں اس
حاکم کی ذمہ داری | نے جو کچھ کہا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے مگر اس دور میں عام عورتیں بھی حکومت کی ذمہ داریوں
کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اس نے کہا کہ

جو شخص حاکم ہو کر رہا یا کے حالات سے بے خبر رہے اس تک شکایات پہنچانے سے کیا حاصل۔

حضرت عمرؓ خاموشی سے پلٹ آئے۔ بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اپنے معاون اسلم سے کہا کہ انہیں میری
پیٹھ پر لا دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دیکھئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلم! اب اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہو گیا
ہے اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھانے دو۔ یہ سامان لاکھ اس عورت کو
دیا۔ اس نے ہنڈیا چڑھائی تو آپ چڑھا پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے سیر جو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔
حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جو لئے خیر دے۔
امیر المومنین ہونے کے قابل تم تھے، نہ کہ عمرؓ۔

فی الحقیقت امیر المومنین ہونے کے قابل یہی تھے۔

افراد معاش کو زندگی پہنچانے کی ذمہ داری اس طرح ادا نہیں ہوتی تھی کہ سربراہ مملکت تو مریض اور بریانی کھائے اور رعایا
جو کی روٹی | کو دل روٹی ملے۔ وہاں کیفیت یہ تھی کہ کوہ کا عامل، عقبہ بن فرقہ ملاقات کے لئے آیا تو امیر المومنین
کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جو کی روٹی تھی۔ اس جہان لے کہا کہ امیر المومنین آپ جو کی روٹی
کیوں کھاتے ہیں۔ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے ؟ اس پر آپ نے کہا کہ

ابن فرقہ! کیا سرزمین عرب میں اس وقت مجھ سے زیادہ صاحبِ مقدرت کوئی ہے ؟

اس نے جواب میں کہا کہ کوئی نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس مقدرت کے باوجود میں جو گیہوں کے بجائے جو کی روٹی کھاتا
ہوں تو اس کی وجہ عدم استطاعت نہیں۔ کچھ اور ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی
روٹی مل رہی ہے۔ اس نے کہا کہ میں ایسا تو نہیں کہہ سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

عمرؓ کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جو کی روٹی میسر آ رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی

اس دن کھائے گا جس دن اسے اس کا اطمینان ہو جائے کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔

آج کل تک میں اسلام کے معاشی قوانین اور اسلامی سٹراٹجی کے متعلق بجا چرچا ہو رہا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس اہم اسلامی سٹراٹجی | حقیقت کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ یہ قوانین اور یہ سٹراٹجی اس مملکت کے لئے ہیں جس میں اسلامی نظام رائج ہو۔ اسلامی نظام کی ایک شق یہ بھی ہے کہ اس میں ہر فرد معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوئی ہے۔ اگر مملکت اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برائہ ہو تو اس میں نہ معاشی قوانین نافذ ہوتے ہیں اور نہ اس قسم کی سٹراٹجی مل سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں حاطب بن ابی بلتعہ کے ملازموں کا واقعہ اہم نظیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ایک شخص کا اونٹ چڑا کر ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ چوری کیوں کی؟ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے کام تو سخت لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپ نے ان ملازموں کو تو معاف کر دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا تمہیں دی جائے اس لئے کہ اس جرم کے ترکب تمہارے ملازم نہیں تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی بہہ رہا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سٹراٹجی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر تمہارے ملازموں کی بھڑکی حالت ہو گئی تو تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔

اس ایک واقعہ سے جرم و سزا کے متعلق جو عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے، اس سے کس قدر سچیدگیاں مل جاتی ہیں حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بھی تھا کہ حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت واجب آتی ہے جب متعلقہ شخص حکومت کے رفاہ عامہ سے مستفید ہو چکا ہو۔ اس ضمن میں ایک آئندہ شدہ غلام (سعید) کا بیان ہے کہ میں اپنی آزادی حاصل ہونے کے بعد حکومت کے واجبات کی رقم جمع کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں، ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اپنی رستم واپس لے جاؤ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لے کر آنا۔

اور رفاہ عامہ کے ضمن میں جو کچھ رعایا پر خرچ کیا جاتا تھا حکومت اس کے بدلے میں شکر یہ تک بھی نہیں | شکر یہ تک کی بھی تمتی نہیں ہوتی تھی جس قسط کا پہلے ذکر آچکا ہے اس کے رفع ہوجانے کے بعد جب قبائل واپس جاتے گئے تو بنی حارث کے ایک شخص نے آپ سے کہا کہ یہ قبائل آپ کے بیحد ممنون احسان اور شکر گزار ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا :-

بھئی! تم نے ایسا کیوں کہا۔ جو کچھ میں نے آپ لوگوں پر خرچ کیا؟ یہاں میلہ یا میرے باپ عطا کی نہیں تھا۔ یہ اللہ کا مال تھا جسے میں نے اللہ کے بندوں پر خرچ کر دیا۔ اس لئے میری شکر گزار ہی کیسی؟

اہل خانہ کو ہدایات | حضرت عمرؓ کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ عمال حکومت کتنے ہی دیندار کیوں نہ ہو جب

تک ان کے اہل خانہ ان کے ساتھ تعاون نہ کریں ان کی دیانتداری کا قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں بات سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح برہہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسلو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں ڈگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہے حدود سے تجاوز کرے۔ جو چاہے ان کے اندر رہے۔

ایک دفعہ آپ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ اور عبید اللہؓ جہاد سے واپس مدینہ آ رہے تھے۔ راستے میں بصرہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے انہیں کچھ روپیہ دیا کہ اسے جا کر بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ انہوں نے گورنر سے کہا کہ انہیں اس کی اجازت ہے کہ وہ راستے میں اس روپیہ سے کچھ کاروبار کر لیں۔ اصل روپیہ بیت المال میں داخل کر دیں اور منافع خود رکھ لیں۔ گورنر نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے... سبیلوں سے پوچھا کہ کیا گورنر نے اس کی اجازت تمہیں ہی دی تھی یا اور لوگوں کو بھی۔ انہوں نے کہا کہ اس نے یہ اجازت ہمیں ہی دی تھی۔ آپ نے کہا کہ اس نے تمہیں یہ اجازت اس لئے دی تھی کہ تم امیر المؤمنین کے بیٹے ہو۔ تمہیں اس کا منافع بھی بیت المال میں داخل کرنا ہوگا۔

ایک دفعہ آپ کو کوفہ کی گورنری کیلئے کسی موزوں شخص کا انتخاب کرنا تھا اور اس میں آپ کو کچھ دشواری پیش آرہی تھی۔ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ میں آپ کو ایسا شخص بتاتا ہوں جو اس منصب کے لئے مہابت موزوں ہے۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا عبداللہ ابن عمرؓ۔ یہ سن کر آپ نے اُسے کہا کہ میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ خدا تمہیں فارت کرے۔ اس باب میں آپ کی نگاہ کس حد تک دور چلی جاتی تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ کا معمول تھا کہ کوئی بچہ یا کھانے پینے کی کوئی اور اچھی چیز آپ آتیں تو انہیں حصہ دے دیتے۔ امیر المؤمنین کو تحفہ بھیجتے۔ حضرت حفصہؓ، ام المؤمنین بھی تحفیں لیکن اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی۔ آپ امیر المؤمنین کے چھٹے لگاتے وقت حضرت حفصہؓ کا حصہ سب سے آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصے میں ہو۔

دوست | ارشتے دار تو ایک طرف۔ جب ایک شخص سے حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں تمہیں عزیز رکھتا ہوں تو اس نے کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ مجھے حکومت کی طرف سے جو مراعات اس وقت حاصل ہیں آپ ان میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ میرے حال پر کرم کیجئے۔ مجھے اپنے اسی مقام پر رہنے دیجئے اپنا عزیز نہ بنائیے



عسیران من! میں کہاں تک ان داستانوں کو پیش کرتا جاؤں۔ سفینہ چاہئے اس بھر بکراں کے لئے۔ پھر وقت کا تقاضا بھی بار بار میرا سامن کھیٹ رہا ہے لیکن اس حکایت درج پر دو کو ختم کرنے سے پہلے میں اس کے دو ایک نرم و نازک گوشوں کو سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر حضرت عمرؓ کا نقشہ کچھ اس قسم کا **شگفتہ مزاجی** سامنے آتا ہے کہ آپ بڑے درشت مزاج، حاد دہاس، عبوس، قطر برہا قسم کے انسان

تھے جن کے ہاتھ میں ہر وقت دُودھ و معاذ اللہ منہ میں تھھاگ، آنکھوں میں شعلے اور ہاتھ پر خشک رہتے تھے۔ زندگی کے دل گزار اور نرم و نازک گوشوں سے کبھی ان کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ان کی یہ تصویر ناقص بھی ہے اور نامکمل بھی۔ ان کی صحیح تصویر اس مردِ مومن کی سی ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تسے پیدا کن از مشتے خجادرے تسے محکم تر از سنگیں حصائرے
درون او دلی درد آشنائے چو جوتے در کنار کھسارے

آپ نے ایک دفعہ ایک شخص کو گودری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پر وازہ لکھوا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا اور آپ کو گود میں بیٹھ گیا۔ آپ نے اسے پیار کیا۔ اس منتخب شدہ شخص نے کہا کہ امیر المؤمنین! میرے دس بچے ہیں مگر کوئی بھی میرے پاس پھٹک تک نہیں سکتا۔ آپ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور! اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں کیا کر دوں؟ اُس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑو۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آسکتا وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا؟ انسان کو گھر میں کیسے رہنا چاہیے اس کے متعلق آپ کا ایک اصول سن لیجئے اور اگر اللہ توفیق دے تو اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے گھر کو جنت بنا لیجئے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ

ان کو چاہیے کہ اپنے اہل و عیال میں بچے کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آئے تو مرد بن جائے۔

ذوقِ جمالیات آپ کا شعر کا ذوق نہایت بلند تھا اور موسیقی کا مذاق بڑا سستہ اور پاکیزہ زندگی کے جمالیات پہلو کے سلسلہ میں آپ کی لطیف حسیات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ آپ نے ایک نابہر مزامن کو دیکھا جس نے دنیا کی ہر نعمت کو اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا۔ اسے سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ خدا تجھے غارت کرے۔ ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے؟

عسذیان من! ان الفاظ کو دہرائیے کہ ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے اور پھر خود کیجئے کہ اسلام کے کتنے تہم و نازک اور تابدار پہلو ان میں مضمر دکھائی دیتے ہیں؟ ایک شخص کو آپ نے دیکھا کہ اس نے بے ہنگم طریق سے اپنی ڈاڑھی بڑھا رکھی ہے۔ آپ نے اسے اپنی طرف کھینچا اور کہا اس بد بیتی کے کیا معنی؟ پھر آپ نے قہقی منگائی۔ اس کی دماغ قطع درست کی اور فرمایا :-

بعض لوگ اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دیتے ہیں گویا وہ درندہ دل میں سے ایک دندہ ہیں۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ ان کے مزاج میں شگفتگی بھی تھی جو کبھی کبھی ہلکے سے کیف آور مزاج کے رنگ میں چھلک پڑتی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے ایک بدو کو دیکھا کہ اس نے جلدی جلدی تماڑ پڑھی اور اس کے بعد دعائمانگی کہ یا اللہ امیری شادی کسی بڑی خوبصورت عورت سے کر دے آپ نے فرمایا کہ اسے دیکھو! مہر کتنا کم باندھتا ہے اور عیوی کیسی بلند پایہ مانگتا ہے؟

جس شخص کی طبیعت میں ایسی طبعِ ظرافت ہو وہ خشک مزاج کیسے ہو سکتا ہے۔ مومن خشک مزاج ہوتا ہی نہیں۔ وہ تو — علم کے حسنِ طبیعت عرب کے سوزِ دروں — کا دلاویز امتزاج ہوتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ذوقِ لطیف

کو خدا اُن کی زندگی پر غالب نہیں آنے دیتا۔



احترام آدمیت اور قطع کا بندہ جو اسلامی ملکت ہی نہیں خود اسلام کا نقطہ ہر کہ اور مغرور کبریٰ ہے۔ یعنی احترام آدمیت۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

برتر از گرد دل مفتاح آدم است اصل تہذیب احترام آدم است
اور اس احترام آدمیت کی جھلک اُس جنت بلبل دور میں قدم قدم پر ملتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ بن حاص نے کسی شخص کو منافق کہہ دیا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ اس کی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ جاؤ اور اس شخص سے معافی مانگ کر اسے راضی کر لو۔ یاد رکھو! بارگاہِ خداوندی میں تدبیل انسانیت سے زیادہ سنگین جرم کوئی نہیں۔

اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ حص کے حاکم حضرت عمرؓ بن سعد (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) کے منہ سے کسی ذمی (غیر مسلم) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے۔ اخذک اللہ۔ خدا تجھے رسوا کرے۔ اس پر انہیں بعد میں اس قدر تادمت اور تأسف ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر استغفار سے دیا اور کہا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں جو شخص نکریم آدمیت کی عظمت و اہمیت کو نہیں پہچانتا ہے وہ اسلامی نظام میں کسی بھی منصب کا اہل نہیں ہو سکتا۔

مواخذہ آخر کا احساس اس قسم کی ملندہ اخلاق۔ پاکیزگی سیرت اور ذمہ داری کے احساس کا جذبہ محرکہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے احساس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا جسے مواخذہ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے آخری وقت میں اس احساس سے ان کے کرب و اضطراب کا یہ عالم تھا کہ روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے کاش! میں عمر ہونے کے بجائے یہ تنکا ہوتا تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے چھوٹ جاتا۔ پھر ان رفقاء کو مخاطب کر کے جو ان کے محاسن کو گنا گنا کر ان کی تعریف کرتے تھے فرمایا کہ تم لوگ میری تعریف کرتے ہو اور جنت کی بشارت دیتے ہو اور مجھے یہ خوف ستارہ ہے کہ

اگر عمرؓ نے کسی پر ظلم کیا ہوگا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہوگی تو اس کی ساری کی ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے حضور رہے ورنہ ہو جائیں گی۔

آخری وقت فرمایا اَنتَ اکر اللہ نے میری لغزشوں سے درگزر نہ فرمایا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ ان الفاظ کے ساتھ ہی اپنی وہ جان کہ جسے ایمان لانے کے ساتھ ہی اللہ کے ہاتھوں بیچ دیا تھا اس کے حقیقی مالک کے سپرد کر دی۔ اور آپ کی وصیت کے مطابق ایک مزدور (حضرت صہیبؓ رضی اللہ عنہ) نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ آپ حضور نبی اکرمؐ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے ہم پہلو، حجرہ حضرت عائشہؓ میں تدفین دفن ہوں۔ آپ سربراہِ مملکت تھے اس لئے آپ کی اس خواہش کے راستے میں کون حائل ہو سکتا تھا؟ لیکن وہاں تو کیفیت ہی کچھ اور تھی۔ آپؐ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ سے کہا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ

عمر آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔ — دیکھنا! امیر المؤمنین عمرؓ نے کبار صرف عمرؓ کو دیکھا۔ اور عرض کرنا کہ وہ مستعدی ہے کہ آپ انہیں پہلوئے حضورؐ رسالت میں دفن ہونے کی اجازت مرحمت فرماویں حضرت عائشہؓ نے کہا کہ وہ جنگ میں لے اپنے لئے غفلت کر رکھی تھی لیکن میں عمرؓ کو اپنے پروردگار دیتی ہوں۔ بیٹے نے آپ کو آنحضرتؐ عائشہؓ کا پیغام سنایا تو آپ خوش ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ جب میں وفات پا جاؤں تو ایسا کرنا کہ میرا جنازہ لے جانا اور حضرت عائشہؓ سے ایک بار پھر اجازت طلب کرنا۔ ممکن ہے انہوں نے اس وقت میری خاطر ایسا کہہ دیا ہو۔ اگر وہ میری وفات کے بعد بھی اس کی اجازت دے دیں تو مجھے وہاں دفن کرتا، ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔

یہ تھے وہ حضرات جن کے ہاتھوں اسلامی نظام قائم اور مستحکم ہوا تھا۔



مصر کے نامور مفکر ڈاکٹر طہ حسینؒ نے بارگاہ فاروقی میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

خراج عقیدت میں نہیں جانتا کہ تا۔ کج الہی کسی ایسے شخص کی مثال پیش کر سکے جو حضرت عمرؓ کا ساتھ نہ دے، حساس، محتاط اور مصیبت سے خائف ضمیر رکھتا ہو۔ جو

اپنے حق میں ان باتوں سے بھی ڈرتا ہو جن میں ڈرنے کی کوئی بات نہ ہو۔ ان امور سے بھی اباکر تا ہو جن سے اباس نہیں کیا جاتا اور اپنی ذات پر ایسی سختیاں کرتا ہو جو صرف ایک اولوالعزم ان ہی کہہ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کی ممکنہ ترقی یافتہ قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں جس مقام پر حضرت فاروق اعظمؓ اس زمانے میں پہنچے تھے۔ لیکن یہ ممکن تو میں آج بھی اس مقام تک سخت جدوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔ (الفتن الکبریٰ)

انسانیکلو پیڈیا آف اسلام میں بھی حضرت عمرؓ کی خدمت میں بڑی تفصیل سے بدیہ تبریک و تحسین پیش کیا گیا ہے۔ میں اس مقام پر اس کا صرف آخری فقرہ پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

عمرؓ کا زمانہ خلافت بظاہر شخصی حکومت کا دور نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جنوں ملوکیت کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔ (۱۹۳۷ء ایڈیشن ص ۹۸)



آپ کے دل میں شاید یہ خیال گزرے کہ یہ تقریب تو عہد سیلا والہ نبیؐ کی تھی لیکن میں نے پیش کیا ہے سیرت عمرؓ اور دورِ عمرؓ کی نہیں۔ ایک امت

شروع میں کہا ہے حضورؐ کا فریضہ رسالت ایسے انسان پیدا کرنا تھا جو آپؐ کی مصیبت میں اسلامی نظام کی بنیاد رکھیں اور آپ کے بعد اس کے فروغ اور استحکام کا باعث بنیں۔ میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا کارنامہ اور معجزہ انسانیت سازی ہے۔ آپ نے دنیا کے سنگ و خشت ہی میں انقلاب برپا نہیں کیا بلکہ دلوں کی بستیوں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ یہ حضورؐ کی انسانیت سازی کا کرشمہ تھا کہ عرب جاہلیت کے ابن المخطوبوں کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں

ان کی تعظیم میں جہانِ بندوبست و تمدن کے دیدہ و دروں کے سر جھکتے ہیں۔ میں نے اسی جہت سے حضرت عمرؓ کو شاہکار رسالتؐ کہہ کر پکے رہا ہے۔ یعنی حضور نبی اکرمؐ شاہکار و خداوندی، اور فاروقؓ اعظمؓ شاہکار رسالتؐ۔

لیکن اس کے معنی نہیں کہ حضورؐ کی تعلیم و تربیت نے صرف ایک عمرؓ پیدا کیا۔ حضورؐ نے ایک جماعت پیدا کی، ایک امت پیدا کی جس کے افراد کی سیرت اسی قالب میں ڈھلی ہوئی تھی۔ قرآن اس جماعت کو گروہ مؤمنین سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ غرض بغرض تعداد ہے کہ ہم انہیں صحابہؓ کہہ کر پکارتے ہیں ورنہ وہ سب کے سب مؤمن تھے جس طرح نبی اکرمؐ نے تنہا اس نظام کی بنیاد نہیں رکھی تھی بلکہ جماعت مؤمنین آپ کے ساتھ تھی، اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی یہ کارنامے تنہا سرانجام نہیں دیئے تھے۔ جماعت مؤمنین کے تعاون اور رفاقت سے سرانجام دیئے تھے۔ اور ان کی سیرت بھی علی قدر مراتب انہی صفات کی آئینہ دار تھی۔ چنانچہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ فوج کے سپاہیوں تک بھی دیانت و امانت کے اسی مقام پر فائز تھے جس پر حضرت عمرؓ فاروقؓ متمکن نظر آتے ہیں، اس سب کا (CREDIT) بالواسطہ حضور رسالتؐ ہی کو پہنچانا ہے۔ یہ سب اسی آفتاب عالمیت کی کرنیں تھیں جو وجہ تباہی عالم ہو رہی تھیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہمارے ہاں تمام تحقیقاتی کوششیں یہ معلوم کرنے کے لئے صرف ہو رہی ہیں کہ صدر اقل میں اسلامی نظام کی ہیئت ترکیبی کیسی تھی، اور اسی کے لئے بحثیں یہ چھڑتی ہیں کہ سروہر طریق انتخاب اسلامی ہے یا نہیں۔ اور اسلامی مملکت میں صلیبی نظام ہوگا یا پارلیمانی وغیرہ وغیرہ۔

لاحاصل بحثیں

اور صدر اقل کے نظام سے متعلق تحقیقات یہی کچھ معلوم کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ لیکن اقل تو اس باب میں متعین طور پر کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ہماری تاریخ اس قدر ناقابل اعتماد اور متنازعہ و ایذا کا مجموعہ ہے کہ اس کی رو سے حتمی اور یقینی طور پر کسی نتیجے پر بھی پہنچا نہیں جاسکتا۔ میرے نزدیک تو یہ تاریخ مسخ شدہ اور غلط ہے لیکن جو حضرات اس تاریخ کی رو سے اسلامی نظام کا نقشہ مرتب کرنا چاہتے ہیں میں ان کی خدمت میں عرض کر دوں گا کہ آپ اس تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور زیادہ نہیں کہ، خلیفہ اقل حضرت ابو بکر صدیقؓ کے انتخاب کی جو تصویر اس میں دی گئی ہے اسے دیکھئے اور سوچئے کہ کیا یہ تصویر اسلامی انتخاب کی ہو سکتی ہے؟ اس میں (معاف اللہ) ایک اُمیدوار کے ہاتھ میں دوسرے کی ڈاڑھی نظر آتی ہے اور دوسرے کے ہاتھ میں شمشیر! اس سے آگے بڑھیے اور حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اس کے بعد کے وہ واقعات سامنے لائیے جو یہ تاریخ پیش کرتی ہے۔ جنگ جمل میں آدھے صحابہؓ ایک طرف دکھائی دیتے ہیں اور آدھے دوسری طرف، اور باہمی خون ریزی کا یہ عالم ہے کہ دس ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کی تلوار کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جنگ صفین کا نقشہ سامنے آتا ہے جس میں ستر ہزار صحابہؓ کام آجاتے ہیں! کیا آپ ایسی قسم کا اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں؟ اس مسخ شدہ تاریخ نے تو ہمیں کہیں کمانہیں رہنے دیا!

یہ تو رہی تلخ تاریخ کی رو سے اس دور کے نظام کی ہیئت وغیرہ کے متعین کرنے کی صورت! اگر بغرض حال اس دور کے نظام کی شکل و صورت متعین بھی ہو جائے تو کیا اس شکل و صورت کا نظام ہمارے دور کے تقاضوں کو پورا بھی کر سکے گا! جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اسلامی نظام نام ہے قرآنی اقدار و اصولِ حیات کو عملاً نافذ کر لے گا۔ اس عملی نفاذ کا طریق اس زمانے میں اور تھا،

اس زمانے میں ہمارے حالات کے تقاضوں کے مطابق اور ہوگا۔ مثلاً، اموہد مملکت کے متعلق قرآن کریم نے یہ اصول دیا ہے کہ **ذَآئِمٌ مَّوَدَّ شَوْءَ رَأٰی بَيْنَهُمْ** "امت انہیں باہمی مشاورت سے طے کرے گی" اس مشاورت کا طریقہ صدرِ اقل میں کچھ اور تھا، ہمارے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کچھ اور ہوگا۔ اس کی وجہ خود حضور نے یہ کہہ کر بیان فرمادی کہ

لوگ اپنے اسلاف کے مقابلے میں اپنے نسل کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔ (احفظ۔۔۔ البیان التبین)

امام ابن قیمؒ نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :-

اللہ کی شریعت کا مقصد بندوں میں عمل والصفات کا قیام ہے جس طریق کے ذریعے عمل والصفات قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (بالطریق الحکمہ)

اسی تغیرِ احوال وکوائف کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے کئی معاملات میں ایسے فیصلے کئے جو عہدِ رسالتؐ و بعدِ رسالتؐ کے فیصلوں سے مختلف تھے اور کئی

حضرت عمرؓ کے فیصلے

امور کے لئے نئے قوانین مرتب اور نافذ فرمائے۔ انہیں "اولیاتِ عمرؓ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت اور عہدِ رسالتؐ میں چند سالوں کا فرق تھا۔ اگر اُن چند سالوں میں زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا تھا کہ سابقہ احکام و قوانین کی جگہ جدید قوانین مرتب کئے جائیں تو آج چودہ سو سال کے بعد یہ تقاضے کہیں کے کہیں جا پہنچے ہیں۔ ان کے لئے آج کی اسلامی مملکت کو قرآنی حدود کے اندر پہنچنے ہوئے لامحالہ جدید قوانین مرتب کرنے ہوں گے۔

لہذا، سوالِ اسلامی نظام یا کسی سابقہ دور کے قوانین کا نہیں۔ اصل سوال ان انبؤں کا ہے جنہوں نے اس

نظام کو قائم کرنا ہے۔ ان انسانوں کی خصوصیات جنہیں مؤمن کہا جاتا ہے بڑی تفصیل سے قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اگر ان خصوصیات کو معیار قرار دے کر صدرِ

اقل کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس میں وہ افراد سامنے آجائیں گے جو ان خصوصیات کے حامل تھے۔ سو بنیادی سوالیہ ایسے انسان پیدا کرنا ہے جو ان خصوصیات کے حامل ہوں۔ ان ہی کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوگا جس طرح عہدِ رسالتؐ اور دورِ صحابہؓ میں قائم ہوا تھا۔

اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ صاحبِ نبی اکرمؐ تو خدا کے رسول تھے۔ ان جیسا کہ دارِ ہم میں کیسے پیدا ہو

سکتا ہے۔ اور صحابہؓ کا ذکر آئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی وہ تو صحابہؓ تھے۔ ہم بندے بشر ان جیسے کیسے بن سکتے ہیں؟ یہ کہہ کر وہ خود بھی مطمئن ہو جاتے ہیں

اس کا امکان نہیں

اور اپنے مخاطب کو بھی غاموش کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں عام لوگ ہی نہیں کہتے۔ اچھے اچھے "عالِمِ دین" بھی ان کے ہمنوا ہوتے ہیں۔ مثلاً: ایک دفعہ مولانا مامین حسن اصلاحی نے اسی قسم کے سوال کے جواب میں کہا تھا :-

آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ہم ابو بکرؓ صدیق اور عمرؓ کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کر دیں۔ نہ بدل کو اس بات کی طاقت حاصل ہے نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔

(حیدر شاہ۔ بابت مئی ۱۹۵۲ء)

اگر کیفیت یہی ہے تو میں بعد ادب پوچھنا چاہوں گا کہ پھر اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کا یہ ڈھنڈورا
 کبے کے لئے پٹیا جاتا ہے؟ پھر چھوڑ دیتے اس سبھی لا حاصل کو۔ اگر یہ ناممکن ہے تو پھر اپنے آپ کو فریب دینے
 سے کیا حاصل؟ لیکن میرے نزدیک صورت یہ نہیں۔ نہ اسوہ چنے کہ اللہ نے نبی اکرم کی سیرت کو نور انسان کے
 لئے اسوہ حسنہ، یعنی بہترین ماڈل قرار دیا ہے۔ اگر ہم میں اس قسم کی سیرت و کردار پیدا نہیں ہو سکتا تو پھر حضور
 کی سیرت ہمارے لئے نمونہ کیسے بن سکتی ہے؟ یاد رکھئے، سلسلہ نبوت تو حضور کی ذات پر ختم ہو گیا۔ سیرت
 رسول اللہ کی آئینہ دہی ختم نہیں ہوئی۔ وہ قیامت تک کے انسانوں کے لئے ماڈل ہے۔
 جہاں تک صحابہ کرام کا تعلق ہے، وہ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) مؤمن تھے اور مؤمنین کا وجود اسی دور
 تک محدود نہیں تھا۔ اور پھر حضور نبی اکرم نے یہ بھی تو فرمایا تھا کہ
 تم پر میری اور میرے صاحب رشتہ و ہدایت خلفاء کی سنت کی پیروی لازم ہے۔

اس اعتبار سے آئے دسے تمام زمانوں کے لئے سیرت رسول اللہ اور سیرت خلفاء راشدین اسوہ حسنہ قرار پاتی ہے۔
 اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سیرت و کردار کے حامل مؤمن قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ بتایا میں جو قوم اسلامی
 کرنے کا کام | نظام قائم کرنے کا عزم ہے کہ اٹھے اس کے لئے (ارشادِ خداوندی اور سنت نبوی کے اتباع
 میں) کرنے کا پہلا کام یہ ہو گا کہ وہ قرآنی تعلیم و تربیت سے مؤمن پیدا کرے جو اس نظام کو
 قائم کر کے چلا سکیں۔ جب یہ مؤمن پیدا ہو جائیں گے تو وہ قرآنی حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے دورِ حاضر کے
 تقاضوں کے مطابق اس نظام کا طریق کار بھی متعین کر لیں گے اور اسلامی قوانین بھی مرتب کر لیں گے۔ اس کے سوا اسلامی
 نظام کے قیام کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اگر ہم اب نہیں کر سکتے تو پھر ہمیں اسلامی نظام کے قیام کے دعاوی ترک
 کر دینے چاہئیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے ناممکن العمل دعاوی سے (یعنی ان دعاوی سے جنہیں ہم عمل میں نہ لا
 سکیں) اسلام دنیا میں بدنام ہو جائے گا۔ وہ ہماری وجہ سے پہلے ہی کم بدنام نہیں ہو چکا جو اس میں مزید اضافہ
 کی ضرورت ہو! یہی وہ جگہ ہاں حقیقت تھی جس سے متاثر ہو کر علامہ اقبالؒ نے چھاتی پر پتھر رکھ کر کہا تھا کہ

تا نداری از محمد سنگ دلو

از دردِ خود می آلا تاں او (پس چہ باید کرد۔ ص ۴)

اگر تشکیل پاکستان کے بعد ہم اپنی تہی نسل کی قرآنی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دیتے تو اس وقت تک وہ قوم تیار ہو
 چکی ہوتی جو اسلامی نظام کے قیام کی اہل ہوتی، لیکن ایسا نہ ہو سکا، اور ہم بھٹکے ہوئے طاہیوں کی طرح کشتِ بیرونار
 میں مصروف مہر انور دی ہیں۔

حسنا این سخت جاں را یار بادا

کہ اقتاد است از ہام بلندے والسلام

=====